اُردو مترجم اہل الکہف۔ایک جائزہ

قمر اقبال ☆

عربی کے اردو تراجم کی تاریخ پر اگر سرسری نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ عربی ادبیات کے شاہکاروں کا ابھی اردو ترجمہ نہیں ہو پایا ہے۔عربی سے جو تراجم اُردو میں ہوئے ہیں اس میں زیادہ حصّہ مذہبیات کا ہے۔ادبیات کے ضمن میں بعض لوگوں نے انفرادی کاوشیں کی ہیں جو یقیناً مستحسن ہیں۔ادبیات میں بھی زیادہ تراجم کہانیوں یا تاریخ ادب کے ہوئے ہیں۔شاعری کا بھی کچھ اُردو ترجمہ ہوا ہے، لیکن عربی ڈراموں کا بہت ہی کم ترجمہ ہوا ہے۔توفیق کے کچھ ڈراموں اور ابھی حال میں علی احمد باکثیر کے ایک ڈرامہ قطط وفیران جس کا ترجمہ 'رشتوں کے رنگ' کے نام سے، ڈاکٹر عبیدالرحمٰن طیب نے کیا ہے، کے علاوہ عربی ڈراموں کا کوئی اُردو ترجمہ میری دانست میں نہیں ہے۔کل ملا کر ادبی تراجم کی جو صورت حال ہے وہ یقیناً تشفی بخش نہیں ہے۔

احقر کے سامنے بیسویں صدی عربی کے ممتاز ڈرامہ نگار توفیق الحکیم کا اُردو ترجمہ ہے، جسے پروفیسر محمد اسلم اصلاحی نے ۱۹۹۰ء میں کیا تھا۔یہ ترجمہ کل ۱۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔مترجم اس وقت کشمیر یونیورسٹی میں ادبیات کے استاد تھے۔اس ڈرامہ کے علاوہ انہوں نے توفیق الحکیم کے دیگر ڈراموں کو بھی اُردو میں منتقل کیا ہے، مثلاً، شہزاد سلیمان الحکیم وغیرہ۔فاضل مترجم کا چونکہ عربی ادب کے ماہر میں شمار ہے اور اردو ان کی مادری زبان ہے اس لیے ترجمہ کی باریکیوں کو ان سے بہتر بھلا کون سمجھ سکتا ہے۔مترجم نے ترجمہ سے قبل توفیق کے اس ڈرامہ پر تقریباً دس صفحات پر مشتمل ایک مقدمہ بھی لکھا ہے، جس میں توفیق کے فن اور اس ڈرامہ کے مرکزی موضوع پر بڑی اچھی گفتگو کی گئی ہے۔اس ابتدائی گفتگو کے بعد مناسب ہوگا کہ عربی میں ڈرامہ نگاری کی تاریخ اور توفیق الحکیم کے فن پر اظہارِ خیال کیا جائے۔

عربی ادب میں ڈرامہ نگاری کی تاریخ یہی کوئی دو سو سال پر محیط ہے اس سے قبل بطورِ فن ہمیں ڈرامہ کی کوئی تصویر نظر نہیں آتی ہے۔عہد عباسی میں کچھ واقعات ایسے ملتے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ کرداروں کا استعمال کر کے کچھ پیغامات دینے کی کوشش

☆ ڈاکٹر قمر اقبال، شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ، انڈیا

کی گئی ہے۔عہد ایوبی میں ''خیال الظل'' کے نام سے کچھ خبریں ملتی ہیں جس میں ڈرامہ کے عناصر ہیں جب کہ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ یونانیوں سے قبل مصر میں ڈرامہ کا رواج تھا۔ا محمد بن دانیال الکحال کے کچھ ڈرامے جنہیں ''خیال الظل'' کے ضمن میں رکھا جاسکتا ہے، دستیاب ہوئے ہیں۔ مصطفیٰ بدوی نے بڑی تفصیل سے ان ڈراموں پر روشنی ڈالی ہے لیکن خود مصطفیٰ کا اس سلسلے میں کہنا ہے کہ ڈراموں کی تکنیک اوراسپرٹ دونوں میں یہ خیال الظل عہد وسطی کے یورپی ڈراموں کے مشابہ ہیں۔ ۲

اس مختصر گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ ڈرامہ نویسی بطور فن عربی میں عہد جدید کی دین ہے۔ جب اہل عرب کا رابطہ مغربی ادبیات سے ہوا، ہارون النقاش (۱۸۱۷ء۔۱۸۵۵ء) پہلا شخص ہے، جس نے فن ڈرامہ نگاری سے عرب دنیا کو روشناس کرایا۔ ۱۸۴۷ء میں الـبـخـيـل کے نام سے اس نے اپنا پہلا ڈرامہ پیش کیا۔اس کے بعد متعدد نام ملتے ہیں، جنہوں نے ڈرامہ نویسی میں کوششیں کیں۔مثلاً نقولا النقاش، ادیب اسحاق، خلیل الیازجی، مصطفیٰ کامل، فرح الظنون وغیرہ۔لیکن ان لوگوں کے ڈراموں کو ابتدائی کاوشوں کے ہی ضمن میں رکھا جاسکتا ہے۔بیسویں صدی کے نصف اول میں یہ فن اس مقام پر پہنچا جہاں اس کو مکمل فن کہا جاسکتا ہے۔اس میں سب سے بڑا نام توفیق الحکیم کا ہے۔اس کی کوششوں سے عربی ڈرامہ عالمی معیار پر جا پہنچا۔ ۳

توفیق کی پیدائش اسکندریہ کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں ہوئی تھی۔والد سرکاری ملازم تھے،اس لیے ٹرانسفر کی وجہ سے توفیق کی ابتدائی تعلیم متعدد شہروں اوراسکولوں میں ہوئی۔اعلیٰ تعلیم قاہرہ میں حاصل کی۔گریجویشن کے بعد اس نے قانون کی تعلیم حاصل کی۔قانون کی مزید تعلیم کے لیے وہ پیرس چلا گیا۔واپس آنے کے بعد اس نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔زمانہ طالب علمی ہی سے توفیق کو ڈراموں سے بڑی دلچسپی تھی۔ابتدائی دور میں اس نے کچھ ڈرامے لکھے اوراسٹیج پر پیش بھی کیے،مثلاً المرأۃ الجدیدہ، العریس وغیرہ۔پیرس میں اس نے یورپی ڈرامہ کا خوب مطالعہ کیا،جس سے اس فن میں اس کو مزید مہارت حاصل ہوئی۔

توفیق الحکیم کی ادبی زندگی بڑی بھرپور رہی ہے۔اس کی تصانیف کو دیکھ کر بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ توفیق نے اپنے قلم کا بھرپور استعمال کیا۔جہاں اس نے علمی تصانیف چھوڑی ہیں وہیں افسانے اور ناولز بھی اس کے قلم سے منظرِ عام پر آئے۔اس کے علاوہ فکری وعلمی مضامین کا بھی ایک بیش بہا سرمایہ اس نے چھوڑا ہے جس کی تفصیل یہاں طوالت کے خوف سے نہیں دی جاسکتی ہے۔توفیق کو اصل شہرت ڈرامہ نگاری میں ملی،اس کے ڈراموں کی مجموعی تعداد ۳۶ سے زائد ہے۔کچھ تاریخی نوعیت کے تو کچھ سیاسی اور سماجی ڈرامے اس نے لکھے ہیں۔کچھ ڈراموں کی بنیاد اس نے دیومالائی کہانیوں کو بنایا ہے۔انہیں ڈراموں سے اس کو عالمی شہرت ملی۔ایسے چھ ڈرامے اس نے لکھے ہیں۔اہلِ کہف ۱۹۳۳ء، شہرزاد ۱۹۳۴ء، براک ۱۹۳۹ء، سلیمان الحکیم ۱۹۴۳ء، بجمالیون ۱۹۴۴ء، ادیب ۱۹۴۸ء، ان اساطیری ڈراموں کے نام ہیں۔

عربی کے ممتاز ناقدوں نے ان ڈراموں کی بڑی تعریف کی۔اہل الکہف کے ضمن میں عمر الدسوقی کا خیال ہے کہ یہ توفیق کا وہ ڈرامہ ہے،جس سے اس فن میں اس نے اپنے قدم جمادیئے۔طٰہٰ حسین جیسے ناقد کے خیال میں توفیق کا یہ ڈرامہ عربی میں پہلی ڈرامائی کہانی ہے۔ڈراموں کے ضمن میں توفیق خود کتنا حساس تھا اس کا اندازہ ہمیں خود اس کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ایک جگہ وہ لکھتا ہے،''فن ڈرامہ نگاری میں اس جد وجہد کا مقصد اس خلا کو پُر کرنا ہے، جو عربی ڈرامہ نگاری میں پایا جاتا ہے۔وہ یہ سفرتیں

سالوں میں طے کرنا چاہتا ہے جو دوسری قوموں نے دو ہزار برسوں میں طے کیا ہے۔ ۵

عربی ڈرامہ نگاری کو عالمی معیار پر لانے کی اس کی یہ کوشش بڑی بارآور ثابت ہوئی کیونکہ اس نے اپنے اس ڈرامائی ادب کی بنیاد ان انسانی صفات پر رکھی جو سارے عالم میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اپنے قلم سے اس نے انسانیت کی بنیادوں کو مضبوط تر بنانے کا عزم مصمم کیا، انسانیت کی تعمیر و ترقی کی ایسی مضبوط اساس وہ بنانا چاہتا ہے کہ آگے چل کر انسانیت کی عمارت کسی طور پر بوسیدہ نہ ہونے پائے۔ تہذیب اس طور سے ترقی کرے کہ مشرق و مغرب دونوں کا حسین امتزاج اس میں دکھائی پڑے اور ایسا بلند انسانی معاشرہ تشکیل پا سکے، جہاں آزادی اظہار رائے ہو، جہاں فکر و عمل پر کوئی قدغن نہ ہو، جہاں معنوی اور مادی کسی قسم کی فیوڈلزم نہ ہو۔''

توفیق کے ڈراموں پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک صاحب نظر نے لکھا ہے کہ،''توفیق کے ڈراموں کا شمار اعلیٰ پائے کے انسانی ادب میں ہوتا ہے۔ ان میں دائمی انسانی مسائل، زمان و مکان سے کشمکش میں اس کو پیش آنے والی پریشانیاں، اپنی ذات اور اس کے وجود کی راہ میں حائل رکاوٹوں سے اس کی نبرد آزمائی دکھائی دینے والی اور نہ نظر آنے والی قوتوں سے اس کا لگاتار برسر پیکار رہنا ان سب چیزوں کا احاطہ اس کے ڈرامے کرتے ہیں۔ اس کے ڈرامے حقیقت اور واقعہ کے درمیان سنگھرش، ترقی اور پچھڑے پن، تنگ دلی اور کشادگی کے درمیان باہمی کھینچ تان سے عبارت ہیں۔'' ۶

اس گفتگو کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ ڈرامہ پر بھی کچھ نظر ڈال لی جائے۔

ڈرامے کا عنوان ''غار والے'' ہے۔ قرآن شریف میں بھی ایک سورۃ اسی نام سے موجود ہے۔ توفیق کو قرآن شریف کے مطالعہ اور اسرائیلی روایات سے اہلِ الکہف کے واقعہ کا علم تھا۔ اس نے انہیں اہل الکہف کو اپنے ڈرامے کا موضوع بنایا۔

ڈرامہ میں کل چار ایکٹ ہیں، کوئی بھی ایکٹ متعدد مناظر والا نہیں ہے۔ مترجم نے پہلے ایکٹ کا ترجمہ منظر کیا ہے اس کے بعد مترجم نے دوسری فصل، تیسری فصل کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اسٹیج کا جہاں تک تعلق ہے تو اس کو سجانے میں بہت زیادہ محنت نہیں کی گئی ہے، جیسا کہ برنارڈ شا کے ڈراموں میں ہوتا ہے، بلکہ اس کے الٹ اسٹیج کا رول ڈرامہ میں اہم تو ہے لیکن اس کو بہت مفصل انداز میں پیش نہیں کیا گیا ہے۔ کرداروں کی جہاں تک بات ہے تو اس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

شیلینیا: نای کردار اس ڈرامہ کا مرکزی کردار ہے جسے ہیرو کہا جا سکتا ہے۔

مرنوش: دوسرا اہم کردار ہے جو ہیرو کا دوست ہے۔

یملیخا: تیسرا اہم کردار ہے جو ان دونوں کے ساتھ غار میں آجاتا ہے۔

قطمیر: اس کتے کا نام ہے جو یملیخا کا تھا اور اس کے ساتھ غار میں مر گیا تھا۔

یہ تمام کردار پہلے ایکٹ میں متعارف ہو جاتے ہیں۔

پریسکا: واحد خاتون کردار ہے، اس کو اس ڈرامہ کی ہیروئن کہا جا سکتا ہے۔

غالیاس: یہ پریسکا کا اتالیق ہے، اسے بھی معاون کرداروں میں رکھا جا سکتا ہے۔

بادشاہ: یہ پریسکا کے والد ہیں۔ کہانی میں اس کا بھی رول ہے۔

اس کے علاوہ بھی کچھ ایسے کردار ہیں جس کی واضح طور پر کوئی شخصیت نہیں ہے، نہ کوئی تصویر ہے۔ ڈرامہ نگار نے ان کا استعمال بھی اثر گیری کے لیے کیا ہے۔

ڈرامہ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں کوئی انسانی کردار ولن کے روپ میں نظر نہیں آتا ہے، جیسا کہ عام ڈرامہ کی کہانیوں میں ہوتا ہے، بلکہ ڈرامہ نگار نے ویلن کا کام ان احساسات سے لیا ہے جو ہیرو اور اُس کے معاون کرداروں میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ منفی احساسات ہی ہیں جو ان کو دوبارہ غار میں واپس لے جاتے ہیں اور موت سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔ یہ منفی احساسات امتدادِ زمانہ کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور انسان تین سو سالوں بعد زندہ ہو کر، جب تمام حالات اس کے موافق ہو جاتے ہیں صرف اس وجہ سے، زندگی تج دینا چاہتا ہے کہ زندہ رہنے کے لیے صرف سانس کا عمل کافی نہیں ہے بلکہ ایک *Sense of Belonging* بھی ہونا چاہیے، جو وہ تین سو سالوں میں کھو دیتے ہیں۔ ڈرامہ نگار نے کہیں بھی (*Soli loqui*) بڑبڑاہٹ، مافوق الفطرت عوامل کو استعمال کر کے کہانی آگے بڑھانے کی کوشش نہیں کی ہے جیسا کہ شیکسپیئر کے ڈراموں میں عام طور پر دکھائی دیتا ہے، بلکہ صرف مکالموں کا استعمال کر کے ڈرامہ نگار نے اپنے مقصد میں بڑے اچھے ڈھنگ سے کامیابی حاصل کی ہے، گو کہ مکالمے کہیں کہیں طویل ہو جاتے ہیں لیکن بڑے بامعنی ہیں کہ دیکھنے والا کہیں بور نہیں ہوگا۔

مصنف نے پلاٹ کا تانا بانا ایک دیو مالائی کہانی کے اردگرد بنا ہے۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ دو لوگ جو بادشاہ کے بہت قریبی ہوتے ہیں۔ بادشاہ کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں کیونکہ بادشاہ کو علم ہو جاتا ہے کہ انہوں نے چپکے سے اس مذہب کو خیر باد کہہ دیا ہے جو بادشاہ کا ہے۔ وہ دونوں لوگ وہاں سے بھاگ کر ایک چرواہے کی مدد سے غار میں جا چھپتے ہیں۔ چرواہے کو بھی علم ہو جاتا ہے کہ یہ اس کے ہم مذہب ہیں اس لیے وہ اور اس کا کتا دونوں اسی غار میں جا چھپتے ہیں، جہاں ان کو نیند آ جاتی ہے۔ پھر جب وہ بیدار ہوتے ہیں تو تین صدیوں سے زائد وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ بیدار ہونے کے بعد وہ اپنے سامنے ایک نئی دنیا پاتے ہیں۔ غار سے باہر نکل کر وہ پھر غار میں واپس آ جاتے ہیں۔ اسی کہانی کے گرد ڈرامہ نگار نے پلاٹ تیار کیا ہے۔ ڈرامہ نگار نے ان عوامل کو جن کی وجہ سے کرداروں کو دوبارہ تاریکی میں جا کر اپنی جان دینی پڑتی ہے، بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ پورے ڈرامہ میں کرداروں کے ذاتی مسائل، ان کی ذہنی کیفیت اور نئی دُنیا سے ان کی نفسیاتی عدم ہم آہنگی کو ڈرامہ نگار نے کچھ اس انداز میں پیش کیا ہے کہ عصرِ حاضر کا تماش بین اس میں کھو جاتا ہے، اس کو یہ مسائل اپنے نظر آتے ہیں۔ یہ کشمکش اسے اپنی دکھائی دیتی ہے، اس کا تجسس کم نہیں ہوتا ہے، آخری مکالمہ اور منظر تک وہ پورے انہماک سے جڑا رہتا ہے، شاید توفیق کی یہی کامیابی ہے۔

ڈرامہ کا مرکزی موضوع کیا ہے اس کو لے کر کچھ اختلاف کی صورت نظر آتی ہے۔ ۱۹۳۷ء میں علامہ نیاز فتح پوری نے نگار میں اس کا آزاد ترجمہ شائع کیا تھا۔ تعارف کے ضمن میں وہ لکھتے ہیں، ''اصحاب کہف کے متعلق جو روایات فلکی صحائف میں پائی جاتی ہیں وہ حقیقت نہیں ہے۔'' وہ آگے لکھتے ہیں، موضوع محبت پر مصنف نے جس بلند تخیل کو صرف کیا ہے وہ مصنف کی بالکل ذاتی چیز ہے۔

علامہ نیاز فتح پوری کے اس خیال کی فاضل مترجم نے، جن کا ترجمہ پیش نظر ہے، اختلاف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں، ''علامہ کا یہ خیال دراصل جدید عربی ادب سے ان کی کم واقفیت کا نتیجہ ہے۔''[۷] مترجم کے مطابق زمانہ کی ستیزہ کاری ہی اس ڈرامہ کا اصل

موضوع ہے۔اپنی بات پر زور دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ''یہی وہ بنیادی فکر ہے جسے توفیق الحکیم مختلف کرداروں کے توسط سے لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔وہ اس سچائی پر زور دینا چاہتے ہیں کہ انسانی زندگی کے لیے مجرد تنفس کا عمل کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ کچھ ایسی باتیں بھی وابستہ ہیں، جن کے بغیر اس دنیا میں رہنا محال ہے۔''۸

جب ہم ڈرامہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ فاضل مترجم کے اس مذکورہ خیال سے عدم اتفاق کی گنجائش کم ہی بچ پاتی ہے۔یقیناً توفیق کے ڈرامہ کے زیادہ تر اہم کرداروں کا المیہ ہی ہے کہ وہ دوبارہ زندہ ہو کر بھی زندگی سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہیں کر پاتے ہیں اور موت کے دامن میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔وقت اور زمانہ کی قوت ناقابل تسخیر نظر آتی ہے، جیسا کہ ڈرامہ کا ایک کردار کہتا ہے، ''زمانے سے ستیزہ کاری بے سود ہے، اس سے قبل اہل مصر نے شباب اور جوانی کے مسئلہ پر زمانہ سے جنگ کرنی چاہی۔مصر میں کوئی مجسمہ بوڑھوں اور ادھیڑ عمر کے لوگوں کا باقی نہیں رہا۔ایک دن مصر سے واپس آئے ایک فوجی سردار نے مجھے بتایا کہ مصر میں دیوتاؤں، آدمیوں اور جانوروں کی صورتوں سے شباب ٹپکتا ہے، وہاں کی ہر چیز جوان ہے، لیکن زمانے نے عین جوانی کی حالت میں مصر کو تباہ و برباد کر دیا۔وہ جب جب چاہے گا اس کو تباہ کرتا رہے گا۔''۹

اس مکالمہ کے علاوہ متعدد مکالمے اور دوسری قوموں کے واقعات اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان زمانہ کے آگے کس طرح ہیچ ہے۔انسان اپنی تمام تر مہارت اور ترقی کے باوجود زمانے کے ہاتھوں برباد ہو جاتا ہے۔

زمانے کی اس ستم ظریفی کی کہانی کے علاوہ انسانی نفسیات کی اس کشمکش سے بھی ڈرامہ عبارت ہے جس میں انسان اپنے آپ کو شئی فاضل تصور کرنے لگتا ہے۔وہ زمانے سے ان عوامل کے کھو جانے کی وجہ سے جن کو وہ حاصل زندگی سمجھتا ہے، بے تعلق محسوس کرنے لگتا ہے۔اس کے اوپر یاسیت طاری ہونے لگتی ہے اور وہ موت کو اپنی پناہ گاہ تصور کرنے لگتا ہے۔توفیق کے اس ڈرامہ میں یاسیت کا یہ پہلو بہت مضبوط نظر آتا ہے۔لیکن کیا ڈرامہ صرف یاسیت ہی سے عبارت ہے، تو اس کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔پورے ڈرامے کے تفصیلی مطالعہ کے بعد بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یاسیت کے مضبوط عناصر کے باوجود ڈرامہ میں ایک ایسا عنصر بھی ہے جو اس چنگاری کو بجھنے نہیں دیتا، جو زمانے سے جنگ کرتا ہوا شکست تو کھا جاتا ہے لیکن اس کی شکست میں بھی زندہ رہنے کی ایک لہر موجود ہوتی ہے۔اس اجمال کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ایک معاون کردار چرداہا (یملیخیا) سب سے پہلے سپر ڈال دیتا ہے، وہ نئی دُنیا میں ایڈجسٹ (ڈھل) نہیں ہو پاتا اور غار میں واپس آجاتا ہے۔دوسرا معاون کردار مرنوش اپنے آپ کو زمانے سے ہم آہنگ کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے، جب اس کے بیوی بچے اسے نہیں ملتے، جو ڈھائی سو سال قبل فنا ہو جاتے ہیں، تب وہ امید ہار بیٹھتا ہے اور غار میں واپس آجاتا ہے۔وہ کہتا ہے، ''میرا بچہ مر چکا ہے، اب اس دنیا سے ربط قائم رکھنے والا کوئی نہیں۔''۱۰

لیکن تیسرا کردار جو ڈرامہ کا مرکزی کردار ہے، وہ آخر وقت تک اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ مرنوش نامی کردار کو سمجھاتے ہوئے کہتا ہے، ''تین سو سال یا اس سے زیادہ مدت محض الفاظ اور گنتیاں ہیں..... مان لو یہ گنتیاں صحیح بھی ہیں تو یہ تمہارے احساس کو کیسے متغیر کر سکتی ہیں۔آج تم زندگی کے سامنے ایک حقیقت کے روپ میں کھڑے ہو۔فرض کرو ایک نئی زندگی تم کو عطا کی گئی ہے تو کیا اس کو قبول کرنے سے تم انکار کرو گے۔''۱۱

اس حقیقت کے باوجود کہ جو پریسکا اس کی آنکھوں کے سامنے ہے وہ اس محبوبہ کی موتیوں کی پوتی کے برابر ہے، اس کی آرزوئیں زندہ رہتی ہیں۔ وہ کہتا ہے، ''یقیناً ہمارے درمیان خلیج ہے لیکن مجھے ان سب باتوں کی پرواہ نہیں ہے، کیونکہ میں صرف حقیقت کو دیکھ کر زندہ ہوں ۱۲۔ لیکن شکست اس کا بھی مقدر ہے، تاریخ کا المیہ اور زمانے کا المیہ اسے بھی پیش آتا ہے، اسی لیے وہ اس حقیقت کا اعتراف کر لیتا ہے کہ ہمارے درمیان ایک بے رحم اور سفاک وجود ہے جسے تاریخ کہتے ہیں۔ مرنوس نے سچ کہا تھا کہ ہمارا زمانہ ختم ہو گیا ۱۳، غار میں وہ بھی واپس آجاتا ہے لیکن اب بھی اس کے اندر آرزوئیں مچلتی ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ زندگی کی جنگ بھلے ہی وہ ہار گیا ہو لیکن اس شکست میں اس کی فتح چھپی ہوئی ہے۔ وہ کہتا ہے، ''ہم خواب نہیں ہیں بلکہ زمانہ خود خواب ہے، ہم حقیقت ہیں وہ مٹتا ہوا سایہ ہے، اور ہم باقی اور زندہ ہیں..... کیونکہ میرے پاس ایک ایسا دل ہے جو محبت کرتا ہے۔'' ۱۴

آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی محبت جیت جاتی ہے، پریسکا خود غار پہنچ جاتی ہے، شیلیدیا جان کنی کے عالم میں ہوتا ہے وہ اس کی زندگی بچانے کی کوشش کرنے لگتی ہے لیکن بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ اگلی زندگی میں دوبارہ ملنے کا وعدہ کے ساتھ شیلیدیا بہت اطمینان سے اپنی محبوبہ کے زانو پر سر رکھ کر موت کے آغوش میں چلا جاتا ہے۔ محبت کا یہ جذبہ زمانے پر فتح یاب ہوتا ہے کیونکہ پریسکا کے لفظوں میں محبت نسلوں اور صدیوں سے بالاتر ہو کر یوں منڈلاتی ہے جیسے بھونرا پھولوں کے اوپر منڈلاتا ہے ۱۵، خود پریسکا بھی اسی محبت کے زیر اثر اسی غار میں زندہ درگور ہو جاتی ہے، اس دعوے کے ساتھ کہ دنیا کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ ایک ایسی عورت تھی جس نے پیار کیا تھا۔ ۱۶

توفیق کے ڈرامہ کا یہ اختتام دراصل امید کا وہ پیغام لیے ہوئے ہے جو آنے والی نسلوں کو حالات کی کشمکش سے کامران نکل آنے کا حوصلہ دیتا ہے، یہی وہ کیتھارسس ہے جو ڈرامہ کو کامیاب بناتا ہے۔ یخیلیا اور مرنوش جیسے کرداروں کو زندہ رہنے کا کوئی بہانہ نہیں ملتا تو وہ نہایت مایوسی کے عالم میں جان دیتے ہیں، جب کہ شیلیدیا جب دنیا چھوڑ آتا ہے تو اس کے چہرے پر امید کی کرن جگمگاتی ہے۔ امید کی یہی کرن دشوار کن راستوں کی ٹھوکروں کو ہنس کر برداشت کر لینے کا حوصلہ دیتی ہے۔

مذکورہ تجزیہ سے بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ڈرامہ کا مرکزی موضوع امتداد زمانہ اور اس کی ستیزہ کاری نہ ہو کر زمانہ اور انسانی جذبات کی کشمکش ہے جس میں وہ شکست کھا جاتا ہے، جس کے پاس زندہ رہنے کا وہ عامل (*Factor*) ختم ہو جاتا ہے جو زندگی میں انبساط کا باعث ہے، اور وہ کامیاب ہو جاتا ہے جس کے جذبات کی یک گونہ اس کشمکش میں فتح ہوتی ہے۔

فاضل مترجم نے ترجمہ کے لیے توفیق الحکیم کے اس ڈرامہ کا انتخاب کر کے اپنی ادبی دلچسپی اور حسن انتخاب کا ثبوت دیا ہے، کیونکہ یہ ڈرامہ عربی کا شاہکار ہے۔ مترجم کی یہ کاوش اردو ادب کے خزانہ میں اضافہ کی ایک گراں قدر کوشش ہے۔ اُردو داں طبقہ اس ڈرامہ کو پڑھ کر یقیناً یہ احساس کرے گا کہ عربی کا دامن ادب کے شاہکاروں سے ابھر پڑا ہے، اگر ادارہ جاتی نظم کے تحت عربی کے شاہکاروں کا اُردو میں ترجمہ کیا جائے تو یقیناً اردو کا دامن اور وسیع ہوگا۔

حواشی وحوالہ جات:

۱۔ المسرحیۃ! نشأتھا و تاریخھا و اصولھا، عمرالدسوقی،دارالفکرالعربی القاہرہ،ص۱۲

۲۔ *Early Arabic drama, M. M. Badvi, Cambridge University Press, 1988, P. 15.*

۳۔ عربی ڈرامہ نگاری کی تفصیلی تاریخ کے لیے مذکورہ بالا حوالہ ملاحظہ ہو۔

۴۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الجدید فی الادب العربی حنا الفاخوری،دارالجیل،بیروت،لبنان،۲۰۰۵ء

۵۔ المسرحیۃ! نشأتھا و تاریخھا و اصولھا،ص۴۱

۶۔ الجدید فی الادب العربی حنا ا لفاخوری،ص۴۰۶

۷۔ اہل الکہف ترجمہ محمد اسلم اصلاحی،نامی پریس لکھنؤ،۱۹۹۰ء،مقدمہ

۸۔ ایضاً،مقدمہ

۹۔ ایضاً،ص۱۲۸

۱۰۔ ایضاً،ص۷۸

۱۱۔ ایضاً،ص۸۱

۱۲۔ ایضاً،ص۱۱۰

۱۳۔ ایضاً،ص۱۱۳

۱۵۔ ایضاً،ص۱۳۳

۱۶۔ ایضاً،ص۱۵۲